حضرت علامہ ڈاکٹر اسرار احمد
امیر تنظیم اسلامی پاکستان

اکیسویں صدی کیا اسلام کی صدی ثابت ہو گی ؟

ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۶۱ میں وارد شدہ الفاظ "ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی۔ اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!" کو پڑھتے ہوئے اطمینان سے گزر جاتے ہیں اسلئے کہ یہ الفاظ یہودیوں کے بارے میں وارد ہوئے ہیں لیکن اگر موجودہ حالات کا معروضی مطالعہ کیا جائے تو اس وقت ان الفاظ قرآنی کا مصداق کامل مسلمان ہیں نہ کہ یہود! یہودی اس وقت پوری دنیا میں کل تیرہ ملین یعنی لگ بھگ سوا کروڑ ہیں جبکہ مسلمانوں کی تعداد کم از کم تیرہ سو ملین یعنی ایک ارب تیس کروڑ ہے۔ گویا مسلمان یہودیوں سے تعداد میں سو گنا زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود اس وقت کرۂ ارضی کی سیاسی قسمت بالفعل یہود کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری کیفیت اس وقت بالکل وہی ہے جس کا نقشہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ایک حدیث مبارک (رواہ احمدؒ وابو داؤدؒ عن ثوبان) میں کھینچا تھا کہ

"مجھے اندیشہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ نہایت کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود تمہاری حیثیت سیلاب کے ریلے کے اوپر جھاگ سے زیادہ نہیں رہے گی"۔

مغرب ہو یا مشرق، اس وقت ساری دنیا میں مسلمان شدید ترین مصائب و آلام سے دوچار ہیں۔ اور سوا ارب سے زیادہ افراد پر مشتمل عالمی ملت اسلامیہ اس وقت بالفعل

ع کہ غیرت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

کا نقشہ پیش کر رہی ہے تو سوچئے کہ الفاظ قرآنی "ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے" کے مصداق اس وقت ہم نام نہاد مسلمان ہیں، یا یہود؟ لیکن یہ حقیقت بھی بیان کر دینی ضروری ہے کہ موجودہ صورت حال مستقل نہیں عارضی ہے اور مستقبل میں بالکل برعکس ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں قوموں اور امتوں کے عروج و زوال کے جو اصول اور عذاب الٰہی کا جو فلسفہ بیان ہوا ہے اور اس پر مستزاد احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں قرب قیامت کے جو حالات و واقعات اور یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کے مابین آخری آویزش اور معرکہ آرائی کے ضمن میں جو پیشین گوئیاں وارد ہوئی ہیں انکے مطابق یہود پر بہت جلد "عذاب استیصال" یعنی جڑ سے اکھیڑ پھینکنے والا

عذاب نازل ہوگا اور وہ "عظیم تر اسرائیل" جسکے خواب وہ عرصے سے دیکھ رہے ہیں اگرچہ ایک بار قائم تو ہو جائے گا لیکن بالآخر وہی انکا عظیم تر اجتماعی قبرستان بنے گا۔ دوسری جانب پورے کرۂ ارضی پر بالآخر امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی حکومت قائم ہوگی اور اللہ کے دین کا بول بالا ہوگا۔ لیکن

"مسلم استی سینہ رااز آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر لا تخلف المیعاد دار"

کے مطابق اس آخری امید سے اپنے سینے کو آباد رکھنے کے ساتھ ساتھ دو اسباب کی بنا پر لازم ہے کہ ہم ان سوالات کے جواب قرآن کے فلسفہ و حکمت کی روشنی میں تلاش کریں کہ اسوقت ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

کے مصداق کامل ہم مسلمان ہی کیوں بن گئے ہیں اور اسکا کیا سبب ہے کہ ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اس لئے کہ ایک عام سادہ لوح مسلمان کی سوچ تو لا محالہ یہ ہے کہ ہم خواہ افعال و اعمال اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے کتنی ہی پستی میں گر چکے ہوں، بہر حال کلمہ گو اور خاتم النبیین اور سید المرسلین حضرت محمدؐ کے امتی ہیں اور "توحید کی امانت" کے حامل اور "ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست!" کے کسی نہ کسی درجہ میں مدعی ہیں جبکہ یہود و نصاریٰ اور بقیہ جملہ اقوام عالم کھلم کھلا کافر و مشرک اور اللہ و رسول کی صاف منکر و مخالف ہیں اور قرآن میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ "اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا" لہٰذا ضروری ہے کہ موجودہ صورت حال کے اسباب اور قرآن کے فلسفہ عذاب کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تاکہ سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۰ یعنی "اور جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث ہوتی ہے اور اللہ بہت سی کوتاہیوں سے تو درگزر بھی کرتا رہتا ہے" کے مطابق یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ یہ حالات و کیفیات

ع اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

کے مصداق ہماری اپنی بے عملی ہی نہیں بد اعمالی کا نتیجہ ہیں۔ قرآن حکیم کی مختلف آیات کو جمع اور مرتب کر کے ان کی پشت پر کارفرما حکمت سمیت بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ :

(۱) یہ دنیا بنیادی طور پر دار العذاب نہیں، دار الامتحان ہے اور جزا و سزا کا معاملہ اصلاً دنیا سے نہیں آخرت سے متعلق ہے۔ جیسے کہ فرمایا گیا سورۂ ملک کی آیت ۲ میں کہ :

"اس نے بنائی موت اور زندگی تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سے اچھے عمل کرنے والا"
اصل محاسبہ ہر انسان کا خالص انفرادی حیثیت میں ہو گا جیسے کہ فرمایا سورۂ مریم کی آیت ۹۵ میں کہ "ان میں سے ہر شخص قیامت کے دن اللہ کے حضور پیش ہو گا فرداً فرداً"
گویا انفرادی سطح پر کسی انسان پر جو مصیبتیں حیات دنیوی کے دوران نازل ہوتی ہیں عذاب یا سزا کے طور پر نہیں۔

(۲) البتہ قوموں اور امتوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی اجتماعی غلط روی اور مجموعی بد اعمالی کی سزا اکثر و بیشتر اس دنیا ہی میں دے دی جاتی ہے۔ اس اجتماعی عذاب کا تلخ ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں گیہوں کیساتھ گھن بھی پس جاتا ہے جیسے فرمایا سورۂ انفال کی آیت ۲۵ میں کہ :
"اور ڈرو اس وبال سے جو تم میں سے صرف ظالموں ہی کو لاحق نہیں ہو گا۔ اور جان رکھو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے"
اگرچہ ان لوگوں کے بچنے کی امید کی جاسکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ خود بدی سے اجتناب کرتے رہیں بلکہ اپنی قوم کو غلط روش اور اللہ کی معیصت اور نافرمانی سے روکنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کردیں جیسے کہ سورۂ اعراف میں اصحاب السبت پر نازل ہونے والے عذاب کے ضمن میں فرمایا
"اور ہم نے بچالیا ان لوگوں کو جو بدی سے روکتے رہتے تھے" (آیت ۱۶۵)

(۳) قوموں اور امتوں پر دنیا میں نازل ہونے والے عذاب کی بدترین اور شدید ترین صورت وہ ہے جس سے وہ قومیں دوچار ہوئیں جن کی جانب اللہ نے اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور انہوں نے ان پر اپنی دعوت و تبلیغ میں سعی بلیغ فرما کر اور حق کی قولی و عملی شہادت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھ کر اتمام حجت کا حق ادا کر دیا۔ اسکے باوجود ان کی قوموں نے بحیثیت مجموعی ان کی دعوت کو رد کر دیا اور حق کی راہ اختیار نہ کی۔

(۴) قوموں اور امتوں پر بحیثیت اجتماعی اس دنیا ہی میں نازل ہونے والے عذاب الٰہی کی دوسری قسم وہ ہے جو رسولوں کی امتوں پر ان کی غلط روی اور بداعمالی کے باعث نازل ہوتا ہے۔ یہ عذاب اس اعتبار سے تو ہلکا ہوتا ہے کہ اسکے ذریعے قوموں یا امتوں کا بالکل خاتمہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس اعتبار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے کہ یہ وقفہ وقفہ سے مسلسل آتا رہتا ہے۔
اس نوع کے اجتماعی عذاب میں مبتلا ہونے والی اقوام یا امتوں کا ایک وصف مشترک، جسے قسمت کی ستم ظریفی ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہے کہ وہ اس زعم میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہم تو اللہ کے بہت چہیتے اور لاڈلے ہیں' اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اس جہل مرکب میں مبتلا قوم پر جیسے جیسے عذاب الٰہی

کے کوڑوں کی شدت بڑھتی جاتی ہے اسکے متذکرہ بالا زعم میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسکی کلاسیکل مثال ہے سابقہ امت مسلمہ یعنی یہود اور نصاریٰ کا یہ قول جو سورۂ مائدہ کی آیت ۱۸ میں نقل ہوا کہ :

''ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں اور اسکے نہایت چہیتے اور لاڈلے!''

جس پر اللہ تعالیٰ نے نہایت عبرت انگیز تبصرہ فرمایا :

''اے نبیؐ ان سے کہیے کہ پھر اللہ تم پر تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں نازل فرماتا رہا ہے؟ تمہارے اس زعم کے برعکس تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے دوسرے جو اللہ نے پیدا فرمائے!''

اسی طرح ان کا ایک مزعومہ عقیدہ یہ بھی تھا کہ

''ہمیں تو (جہنم کی) آگ چھو ہی نہیں سکتی سوائے گنتی کے چند دنوں کے!''

جس پر نہایت فصیح وبلیغ تبصرہ وارد ہوا :

''اے نبیؐ ان سے پوچھئے کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے جس کے بارے میں تمہیں وثوق ہے کہ اللہ ہرگز اپنے اس عہد کی خلاف ورزی نہیں کریگا؟ یا تم بغیر کسی علم کے اللہ کی جانب غلط باتیں منسوب کر رہے ہو؟'' (سورۂ بقرہ : ۸۰)

اس نوع کے اجتماعی عذاب کے بارے میں یہ قاعدہ کلیہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ ؎

جن کے رتبے ہیں سوا
ان کی سزا مشکل ہے

کے مطابق کسی امت کو جس قدر بلند درجہ فضیلت حاصل ہوتا ہے اسکے غلط طرز عمل پر عذاب کی شدت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔

(۵) مندرجہ ذیل مباحث سے یہ نتیجہ از خود برآمد ہو جاتا ہے کہ جو قوم نہ کسی رسول کی امت ہونے کی مدعی ہو نہ ہی اس کی جانب اس کی یاداشت اور معلوم و محفوظ تاریخ کی حد تک کوئی رسول مبعوث ہوا ہو اس کے عذاب و ثواب اور جزا و سزا کا سارا معاملہ آخرت سے متعلق ہے۔ دنیا کی حد تک تو ان پر صرف سپنگلر کے فلسفۂ تاریخ کے مطابق اس قانون طبعی ہی کا اطلاق ہوگا کہ جیسے ہر فرد پیدا ہوتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے، پھر بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے ایسے ہی قومیں اور تہذیبیں بھی مختلف طبعی ادوار سے گزر کر بالآخر ختم ہو جاتی ہیں۔ رہا حیات اخروی اور یوم قیامت کے محاسبہ کا معاملہ تو وہ تو ہر فرد نوع بشر کا اپنے اپنے نظریات و عقائد اور اخلاق و اعمال کے اعتبار سے طے ہونا ہی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ دنیا میں جو رسول مبعوث ہوئے ان کی کل تعداد کتنی ہے، وہ آسمانی کتابیں جن کے ذریعے نوع انسانی کو شریعت خداوندی عطا ہوئی دو ہی ہیں یعنی اولاً تورات جو بنی اسرائیل کیلئے ہدایت قرار دی گئی (سورۂ بنی

اسرائیل آیت ۲ اور سورۂ سجدہ آیت ۲۳) اور ثانیاً قرآن حکیم جو پوری نوع انسانی کیلئے ہدایت ہی نہیں "الہدیٰ" قرار دیا' چنانچہ صاحبِ کتاب و شریعت مسلمان امتیں بھی پوری تاریخ انسانی کے دوران دو ہی ہوئی ہیں یعنی :

ایک سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل اور دوسری موجودہ امت مسلمہ یعنی امت محمدیہ ﷺ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام اور چونکہ اس وقت دنیا کے حالات تیزی کے ساتھ جو رخ اختیار کر رہے ہیں اور مستقبل میں جو حوادث و واقعات پیش آنے والے ہیں ان کے ضمن میں ان دونوں امتوں کی باہمی آویزش اور ان کے آخری انجام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس قانون عذاب کو فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل ہے لہذا ان دونوں کے بعض مشترک اور بعض مابہ الامتیاز خصائص کے علاوہ ان کے ماضی اور حال کا مختصر جائزہ ضروری ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کا آغاز اگرچہ ویسے تو لگ بھگ ۱۸۰۰ قبل مسیح علیہ السلام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے سے ہوتا ہے اس لئے کہ انہی کا لقب اسرائیل یعنی "اللہ کا بندہ" تھا اور بنی اسرائیل ان ہی کی اولاد ہیں، لیکن ان کو امت مسلمہ کی حیثیت تقریباً ۱۳۵۰ ق م میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حاصل ہوئی جب انہیں تورات عطا ہوئی۔ اس وقت سے لے کر ساتویں صدی عیسوی کے آغاز تک جب خاتم النبیّین اور سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی؛ گویا لگ بھگ دو ہزار برس تک، بنی اسرائیل ہی کو اس دنیا میں کتاب الٰہی کی امین اور شریعت خداوندی کی حامل امت مسلمہ کی حیثیت حاصل رہی۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت تمام سابق انبیاء و رسل کے مانند صرف اپنی اپنی قوموں کی جانب نہیں، بلکہ پوری نوع انسانی کی جانب ہوئی جیسے کہ فرمایا سورۂ سبا کی آیت ۲۸ میں کہ

"ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کیلئے بشیر اور نذیر بنا کر"

لہٰذا آپ کی امت گویا اجتماعی طور پر تا قیام قیامت فریضہ رسالت کی امین بھی ہے، یعنی اس کی ذمہ داری سابقہ امت مسلمہ کی طرح صرف یہ نہیں ہے کہ خود کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامے رہے اور شریعت خداوندی پر سختی سے کاربند رہے بلکہ یہ بھی ہے کہ پوری نوع انسانی تک رسالت محمدی ﷺ کے پیغام کو پہنچانے کا حق ادا کرنے اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کے غلبے یعنی عالمی سطح پر حکومت الٰہیہ یا خلافت علی منہاج النبوۃ کے نظام کے قیام کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ اس لئے کہ یہی از روئے قرآن نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت ہے۔ جیسے کہ قرآن حکیم میں تین بار فرمایا گیا

"وہی ہے (اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق دے کر تاکہ غالب کریں اسے (دین حق کو) پورے کے پورے دین (نظام زندگی) پر" (سورۂ توبہ آیت ۳۳،

سورۂ فتح آیت ۲۸ اور سورۂ صف آیت ۹) سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کے مابین ایک اور فرق و تفاوت یہ ہے کہ جہاں سابقہ امت مسلمہ ایک "یک نسلی امت" تھی وہاں چونکہ آنحضور ﷺ کی بعثت پوری نوع انسانی کی جانب ہے لہذا موجودہ امت مسلمہ ہمہ نسلی اور ہمہ قومی (ملٹی نیشنل) امت ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے دوران معزول شدہ اور موجودہ مسلم امتوں یعنی یہودیوں اور مسلمانوں دونوں پر اللہ کے عذاب کا وہ سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ بعض اعتبارات سے شدید تر ہو گیا جو یہودیوں کے معاملے میں تو لگ بھگ دو ہزار برس سے جاری تھا اور مسلمانوں کے معاملے میں بھی کئی صدیوں سے چلا آرہا تھا، لیکن دوسری جانب ان دونوں ہی امتوں میں ایک احیائی عمل بھی شروع ہوا اور دونوں ہی بعض اعتبارات سے تیزی کیساتھ ترقی اور عروج کی جانب بڑھتی نظر آئیں۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون عذاب کے مطابق یہودی اب سے لگ بھگ دو ہزار سال قبل عذاب استیصال کے مستحق ہو چکے تھے۔ اسلئے حضرت مسیح علیہ السلام انکی جانب رسول کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے، لیکن یہودیوں نے نہ صرف یہ کہ ان کا انکار کیا بلکہ اپنے بس پڑتے انہیں سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا تاہم ایک خاص حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس آخری سزا کی تنفیذ کو مئوخر رکھا۔ بیسویں صدی عیسویں میں ایک جانب سابقہ اور معزول شدہ امت مسلمہ یعنی یہودیوں پر اللہ کے آخری عذاب استیصال کا ریہرسل یا ٹریلر بھی "ہولوکاسٹ" کی صورت میں سامنے آگیا اور دوسری طرف فلسطین میں قدم جمانے سے ان کے اس آخری عروج کی جانب بھی نمایاں پیش قدمی ہو گئی جس کا کوئی سان گمان بھی ایک صدی قبل نہیں ہو سکتا۔

یہی معاملہ موجودہ امت مسلمہ کے ساتھ پیش آیا کہ جہاں ایک جانب اس صدی کے آغاز میں سلطنت عثمانیہ اور خلافت اسلامی کے خاتمے، اور پھر ۱۹۶۷ء میں عربوں کی عبرتناک ہزیمت اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی اور ۱۹۷۱ء میں "آخرین" کے اہم ترین اور عظیم ترین ملک یعنی پاکستان کی شکست وریخت اور ان ہندوؤں کے ہاتھوں شرمناک ہزیمت کی صورت میں عذاب الٰہی کے سائے مزید گہرے ہو گئے جن پر مسلمانوں نے سینکڑوں برس حکومت کی تھی، وہاں دوسری جانب یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ پورے عالم اسلام میں ایک احیائی عمل شروع ہو گیا اس احیائی عمل کے متعدد گوشے ہیں، جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرپیکار ہیں۔ اور جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کیلئے باعث تقویت ہیں۔

دوسرے یہ ہیں کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور ملت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل

ہونے والا نہیں بلکہ سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۹ "تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ" کے مصداق تدریجاً بہت سے مراتب و مراحل سے گزر کر ہی پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے بقول علامہ اقبال ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس وسیع احیائی عمل کی پنہائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے۔ برصغیر پاک و ہند کو پورے عالم اسلام میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے اس کی وجہ بھی بادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی جامع شخصیت گزشتہ تین سو سالوں کے دوران میں پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کی توجہ علم دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث کی جانب منعطف کرانے کیساتھ ساتھ فکر اسلامی کی تدوین نو کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں دین اور رجال دین کی ساکھ از سر نو مضبوط ہو گئی۔ برصغیر میں اس سلسلے میں ایک اہم مقام اور مرتبہ دیوبندی مکتب فکر کو حاصل ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے "فکر" کا وارث ضرور ہے۔ وہ جماعتیں اور تنظیمیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں مختلف مسلمان ممالک میں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہیں ہیں لیکن انکی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہستیوں کی ہے۔ ان جماعتوں میں اگرچہ ایک دور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر و نفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی الاخوان المسلمون توجہات اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برصغیر ہندوپاک ہی کو حاصل ہے۔

اس امر سے قطع نظر کہ ان تحریکوں کی نصف صدی سے زائد کی مساعی کا حاصل کیا ہے اور پالیسی اور طریق کار کے بارے میں اختلافات کے سبب سے یہ کتنی شاخوں میں تقسیم ہوئی ہیں۔ یہ امر مسلم ہے کہ یہ تحریکیں مجموعی اعتبار سے عالم اسلام میں احیاء اسلام کی امنگ کا مظہر ہیں اور اب عالمی سطح پر انہیں ایک امر واقعی کی حیثیت سے تسلیم کیا جارہا ہے۔ مستقبل قریب میں جو عظیم واقعات و حوادث رونما ہونے والے ہیں ان کی تہہ میں اصلاً ان ہی دو امتوں کی آخری آویزش کار فرما ہوگی۔ اگرچہ اس میں بظاہر زیادہ اہم اور نمایاں کردار ایک تیسری امت ادا کرے گی۔ جو ابراہیمی (علیہ السلام) مذاہب کے "ثالث ثلاثہ" یعنی تین میں سے تیسرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ "ثالث ثلاثہ" کے الفاظ قرآن حکیم میں

سورہ مائدہ کی آیت ۷۳ میں عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث کے ضمن میں وارد ہوئے ہیں۔ عیسائیت تعداد نفوس کے اعتبار سے تو ابراہیمی (علیہ السلام) مذاہب میں سب سے بڑا مذہب ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمی (علیہ السلام) مذاہب کی جانب اس کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے نام یا زیادہ سے زیادہ ان کی ذات اور شخصیت کی حد تک محدود ہے ورنہ عقائد و نظریات کے اعتبار سے موجودہ عیسائیت ایک بالکل جدا مذہب ہے جس کا شمار "فلسفیانہ مذاہب" میں ہونا چاہیے نہ کہ "آسمانی مذاہب" میں اور جس کی اصل نسبت سینٹ پال کی جانب ہونی چاہیے نہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب۔ بہر حال ہمارے موضوع کے اعتبار سے اس مذہب کے نام لیواؤں کا اہم ترین رول یہ ہے کہ دونوں اصل ابراہیمی (علیہ السلام) امتوں پر عذاب الٰہی کے دوسرے دور میں سزا کے کوڑے بالفعل ان ہی کے ہاتھوں پڑتے رہے ہیں۔ یہودیوں کیلئے سولہ سو برس تک اور مسلمانوں کیلئے ایک ہزار برس سے عیسائیوں نے عذاب کے کوڑے کا کردار ادا کیا ہے اگرچہ بیسویں صدی عیسوی کے دوران یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین تعلقات کی نوعیت میں تو ایک انقلاب عظیم رونما ہو چکا ہے جسکے نتیجے میں اب مسیحی دنیا بالخصوص "واسپ" یعنی "وہائٹ اینگلو سیکسن پروٹیسٹنٹس" یہودیوں کے بظاہر معاون و محافظ اور مددگار اور سرپرست، اور بباطن

ع فرنگ کی رگ جان پنجہ یہود سے ہے

کے مطابق زیر نگیں اور حاشیہ بردار بن چکے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے معاملے میں ان کا سابقہ کردار پوری طرح برقرار ہے اور "ترسم کہ دگر خیزد" کے مصداق اندیشہ ہے کہ عنقریب مغرب کی عیسائی اقوام کی ایک عظیم یلغار "حتی اذا فتحت یا جوج وماجوج" (سورۂ انبیاء آیت ۹۶) کی سی شان کیساتھ عالم اسلام بالخصوص شرق اوسط پر ہونیوالی ہے، جسکی صریح پیشینگوئیاں احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں موجود ہیں اور جسکی ایک ادنیٰ جھلک دنیا نے خلیج کی جنگ کے دوران دیکھ بھی لی ہے۔

اس وقت دنیا کی کل انسانی آبادی چھ ارب کے لگ بھگ ہے اس میں سے نصف سے زائد آبادی تین ابراہیمی (علیہ السلام) مذاہب کی پیروکار ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں میں سب سے بڑی تعداد ہندوؤں کی ہے پھر بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ایں دم تک دین برحق اسلام ہی رہا ہے۔ اور دنیا کے باقی جملہ مذاہب آسمانی ہدایت اور انبیاء اور رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات ہی کی محرف اور تبدیل شدہ صورتیں ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر کی صورتیں اتنی بدل چکی ہیں کہ اب بقول جگر مرادآبادی:

ع کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

البتہ صرف دو مذہب وہ ہیں جن کا اصل "اسلام" کیساتھ تعلق اور تسلسل کم از کم تاریخی اعتبار

سے ثابت ہے یعنی یہودیت اور نصرانیت۔ ان میں سے بھی اصل مسلمان امتیں دو ہی ہیں، یعنی سابقہ امت مسلمہ بنی اسرائیل اور موجودہ امت مسلمہ یا مسلمان۔ اور آئندہ اصل اور فیصلہ کُن معرکہ تو ان ہی کے مابین ہوگا لیکن مستقبل قریب میں ابتداً نمایاں کردار ادا کریں گے ابراہیمی (علیہ السلام) مذاہب کے "تین میں کے تیسرے" مذہب کے پیروکار یعنی عیسائی۔

جہاں تک اسلام کے عالمی غلبے کا تعلق ہے، اگرچہ اسکی کوئی قطعی نص تو (کم از کم راقم کے علم کی حد تک) قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے۔ تاہم منطق کے اس قضیئے کے صغریٰ اور کبریٰ دونوں قرآن مجید میں بہ تکرار و اعادہ وارد ہوئے ہیں جس کا لازمی نتیجہ دین حق کا عالمی غلبہ ہے۔ رہیں احادیث نبویہؐ تو ان میں تو یہ خبر نہایت وضاحت اور صراحت کے ساتھ دی گئی ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ اب جہاں تک ان عظیم حوادث و واقعات کا تعلق ہے جو اسلام کے عالمی غلبہ سے قبل پیش آنے والے ہیں یعنی ایک عظیم اور نہایت ہولناک اور تباہ کن جنگ، دجال کا خروج ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، اور ان کے ہاتھوں دجال کا قتل اور یہودیوں کا استیصال، تو اس سلسلے کی پہلی کڑی یعنی ایسی ہولناک اور تباہ کن جنگ جس کا میدان مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک بنیں گے اب بالکل نوشتہ دیوار کی مانند سامنے کی بات ہے۔

مسلمانوں کے لئے کیسے کیسے سخت مراحل اور صبر آزما امتحانات آنے والے ہیں اور ان کے جلو میں تباہی، ہلاکت اور خون ریزی کے کیسے کیسے طوفان اٹھنے والے ہیں ہمیں بالعموم یہ کہہ کر تھپکی اور لوری دے دی جاتی ہے کہ بس اب پندرھویں ھجری صدی (اکیسویں صدی عیسوی) غلبہ اسلام کی صدی ہے اور روشن مستقبل ہمارا منتظر ہے اور ہم خوش ہو جاتے ہیں اور ان "امانی" سے بہل جاتے ہیں اور ہمیں ان فرائض کا احساس نہیں ہوتا جو اعلائے کلمۃ اللہ، احقاق حق، ابطال باطل، اور غلبہ دین متین کی سعی و جہد کے ضمن میں ہر کلمہ گو کے ذمے ہیں۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں ، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے